ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

پروفیسر، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اقبال: فکر و فن کا ایک امتزاج

Dr Aziz Ibnal Hansan

Professor,Department of Urdu, IIUI

Iqbal's Poetically Mediated Thought

Allama Iqbal was an Distinguished poet-philosopher and the most influential Muslim thinker of the twentieth century. His philosophy and thought is not an abstract intellectual activity devoid of life but a combination of mystical insight and poetical sensibility. He made a creative engagement between conceptual thought and artistic expression.

The task of this article is to describe that the nature of the philosophy as developed by Allama Iqbal, specially in his poetry, is not abstract intellectual activity devoid of life but is meant to mingle with common life's needs. And that, Surprisingly, the poetically mediated thought of iqbql is in the line of Ameer Khusro, the First theorist of Subk-e Hindi poetics, the Indian style of Persian poetry, in muslim India.

یہ مختصر سا مضمون اس امر سے بحث کرتا ہے اقبال کے ہاں اعلیٰ فکری دانش اور اعلیٰ شاعری اور آرٹ کس طرح مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اعلیٰ فکر و دانش سے مراد زندگی کے وہ بنیادی سوالات ہیں جن کی معنویت اور اہمیت متغیّر حالات میں بھی تبدیل نہیں ہوتی اور اعلیٰ شاعری اور آرٹ سے مراد وہ فنی مہارت ہے جو فکر معقول کو بھی فکر محسوس میں تبدیل کر کے قاری یا مخاطب کے خون میں اتار دیتی ہے۔

ایس ای فراسٹ (S E Frost) نے 1949ء میں *The Basic Teachings of the Great Philosophers* کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے فلسفے کے ان خاص مسائل کی تلخیص کر کے جو انسان کے فکری سفر میں بار بار فلسفیوں کے زیر بحث آتے رہے، ان کے بارے میں تمام اہم فلسفیوں کے خیالات جمع کئے تھے اور ان مسائل کو انہوں نے دس اہم سوالوں کی صورت میں بیان کیا تھا۔ وہ دس سوالات مختصر طور پر یہ ہیں۔

۱۔ اس کائنات کی ماہیت کیا ہے؟

۲۔ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟

۳۔ خیر وشر کیا ہے، یعنی یہ اضافی تصورات ہیں یا ان کی مطلق حیثیت ہے؟

۴۔ خدا کی ماہیت کیا ہے؟

۵۔ جبر وقدر کیا ہے؟ یعنی انسان پابند تقدیر ہے یا مختار کل یا دونوں کے بین بین ہے۔ اگر وہ مجبور ہے تو عتاب وثواب کیسا اور اگر آزاد ہے تو پھر تقدیر کا کیا مطلب ہے؟

۶۔ روح اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ لافانی ہے یا فنا پزیر ہے؟

۷۔ انسان اور ریاست کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یعنی انسان دنیا میں اکیلا نہیں رہ سکتا اسے اپنے لیے کوئی نظم اجتماعی قائم کرنا پڑتا ہے، تو اس کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

۸۔ انسان اور اس کی تعلیم۔ یعنی انسان کو کیسی تعلیم دی جائے کہ وہ معاشرے اور ریاست کے لیے مفید بن سکے۔

۹۔ ذہن اور مادہ، ذہن کی حقیقت کیا ہے اور مادے کا ذہن سے کیا تعلق ہے؟ مادے سے شعور کیسے پیدا ہوتا ہے اور پھر فنا کیسے ہو جاتا ہے؟

۱۰۔ فکر وخیال۔ کہ انسانی ذہن میں خیال کہاں سے آتا ہے، کیا یہ اس کے اندر بالذات موجود ہوتا ہے؟ یا وہ باہر سے آئیڈیاز اخذ کرتا ہے۔

دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں نے ان تمام سوالات کے ساتھ یا ان میں سے اکثر کے بارے میں کوئی نہ کوئی موقف ضرور اختیار کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ کوئی بڑا فلسفہ یا نظام فکر اس وقت تک valid نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان بڑے سوالات سے اپنا معاملہ صاف نہ کر لے۔

جب ہم اپنے ماضی قریب کی فکری تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اقبال اپنی روایت کا آخری بڑا فنکار نظر آتا ہے جو ان میں سے کم وبیش تمام سوالات پر نہ صرف اپنے زمانے کے مخصوص حالات کی روشنی میں نظر ڈالتا ہے بلکہ ان کی ایک ایسی تعبیر بھی پیش کرتا ہے جو امت مسلمہ کو صدیوں کے فکری زوال اور سیاسی ادبار سے نکالنے کا ایک پیش قیمت نسخہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ان دس سوالوں کو اگر مزید مختصر کیا جائے تو انہیں ''انسان''، ''کائنات'' اور ''خدا'' کی تکون میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ اقبال اپنے نثری وشعری کلام میں نہ صرف انسان، کائنات اور خدا _____ اور ان کے باہمی تعلق کے مختلف پہلوؤں کی تلاش وجستجو کرتا ہے بلکہ اسے تاریخ کے ایک مخصوص دور میں اپنی قوم کو اقوام عالم میں ایک زندہ وفعال قوت بنانے، بلکہ، اسے مقام امامت پر فائض کرنے کا ذریعہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

اپنے خطبات *The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam* کے بالکل آغاز میں اقبال یہ سوال اٹھاتا ہے کہ

> ''جس کائنات میں ہم رہتے ہیں اس کی ماہیت اور عمومی ساخت کیا ہے، کیا کائنات کی تشکیل وترکیب میں کوئی مستقل عنصر موجود ہے، ہمارا کائنات سے تعلق کیا ہے اس میں ہمارا مقام کیا ہے، اس مقام سے مناسبت رکھنے والا ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوالات مذہب، فلسفے اور اعلیٰ شاعری کے مشترک موضوعات ہیں''۔(۱)

اپنے پہلے خطبے ''علم اور مذہبی واردات'' (Knowledge and Religious experiecs) کے شروع ہی میں اقبال نے جو ''اعلیٰ شاعری'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ میرے خیال میں اس کی بہت خاص معنویت ہے جس پر میں آگے اشارہ کروں گا۔ ایسا نہیں ہے کہ خطبات میں یہ سوال اقبال نے پہلی دفعہ اٹھایا ہے بلکہ ایک اعتبار سے دیکھیں تو یہ فکر انسانی کے محولہ بالا دس سوالات ہی کے بعض اجزاء ہیں

جنہیں اقبال نے اپنے زمانے کی مخصوص سائنس اور فکر کی پروردہ ذہنی ساخت کے پس منظر میں نئی زبان دی ہے۔ یہی کام وہ اپنی شاعری میں بھی مدتوں سے کر رہے تھے۔ مثلاً جاوید نامہ میں انہوں نے اس پورے اضطراب کو ایک مصرعے میں سمو دیا ہے۔

چیست عالم، چیست آدم، چیست حق (۲)

بیسویں صدی میں ہمارے ہاں کوئی ایک فلسفی، فنکار اور شاعر ایسا نہیں ہے جس کے ہاں یہ سوال اس روحانی اضطراب کے ساتھ آیا ہو اور جس کا خواب اقبال جیسے وثوق اور تیقن آمیز ایجاب کے ساتھ دیا گیا ہو_____ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ کیونکہ ہمارے فنکاروں کا تصور شعر و ادب تو اس زمانے کی مخصوص سیاسی سماجی و معاشی صورت حال یا فرد کے نفسیاتی اور نفسانی آشوب اور جبلی خواہشات کی سطح سے اوپر اٹھتا ہی نہیں۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوف خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیال روز جزا گیا

بہر کیف عالم، آدم اور خدا کے بارے میں مذہب فلسفے اور اعلیٰ شاعری کے یہی وہ مسائل ہیں جس کا اقبال اپنی نظم و نثر میں جواب دیتے ہیں۔ بقول کسے ان سوالوں کا جواب اقبال دین سے اخذ کرتے ہیں، فلسفے اور سائنس کی روشنی میں ان کی تعبیر کرتے ہیں اور اس کا بیان شعری اسلوب میں کرتے ہیں۔ (۳)

فن اصل میں حسن بیانِ حسن کا نام ہے اور حسن خیر مطلق اور حقیقت عالیہ کا جمالیاتی اظہار ہوتا ہے۔ تعبیر حقائق اور حسن بیان سے مشرق کی بڑی شاعری کو ہمیشہ ایک خاص سروکار رہا ہے جو ایک طرف اعلیٰ حقائق سے بھی تعلق رکھتی ہے تو دوسری طرف ادنیٰ نفسی کیفیات کے مظاہر کو بھی ان حقائق کی معرفتوں کا ذریعہ بنا لینے میں بھی عار محسوس نہیں کرتی_____ اسی روایت کے تسلسل میں بھی جب ہم اقبال کو دیکھتے ہیں تو ان کی شاعری میں ہمیں شعر و حکمت کا آخری بڑا امتزاج اور اس کا فنی اظہار نظر آتا ہے۔

ہندوستان میں سبک ہندی کے پہلے اور سب سے بڑے نظریہ ساز امیر خسرو نے اپنے معروف دیوان *غرۃ الکمال* کے دیباچے میں شعر کو علم کا خزانہ اور بزرگ تر معاملات سے سروکار رکھنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ (۴) یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں فن کے حکیمانہ اور فنکارانہ شعور کی نظریہ سازی اور اس کے عملی نمونوں کی پیش کاری کی ایک انتہا پر خسرو کھڑے ہیں اور دوسری انتہا پر اس روایت کے اب تک کے خاتم اقبال براجمان ہیں۔ خسرو کے دور میں چونکہ مسلمان برصغیر میں ایک غالب تہذیبی قوت تھے، ان کے عمومی رویوں میں بھی ایک بے نیازانہ اخذ و قبول کا تالیفی جوہر پیدا ہو چکا تھا اور ان کا تخلیقی وفور بظاہر مختلف ارضی و سماوی عناصر کو ملا کو شعر و ادب اور موسیقی میں نئی فنی اوضاع تشکیل دے رہا تھا اس لیے خسرو کو اس سے غرض نہیں تھی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تارگشتہ ، حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم باخلق مارا کار نیست

یاد رہے کہ، بقول سراج منیر، یہاں نہ کفر فقہی معنوں میں کفر ہے اور نہ ایمان فقہی معنوں میں ایمان بلکہ یہ تو تہذیب کے تشکیلی عناصر ترکیبی کے بیان کی اصطلاحیں ہیں۔ (۵)

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

لیکن اقبال کا زمانہ آتے آتے خسرو کے دور کی اقبال مندی مسلمانوں کے سیاسی زوال میں بدل چکی تھی اور مجدد الف ثانی نے ہندی مسلمانوں کے دور عروج میں ہندو معاشرت کے سمندر میں مسلمانوں کے امتیازی ملی وجود کے تحفظ کی جو لہر پیدا کی تھی اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت انگریزی اقتدار کے خاتمے کے قریب سب سے زیادہ شدت سے اقبال ہی نے محسوس کی تھی، اس لیے وہ خسرو کی طرح خلق سے بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا بدلے ہوے حالات میں اپنی قوم کی رہنمائی کرنا اور خدا اور کائنات کے درمیان انسان کی حیثیت متعین کرنا اقبال کا خاص مسئلہ تھا۔

چیزیں چونکہ اپنے اضداد میں بھی خوب نظر آتی ہیں اس لیے اقبال کی کشمکش کو سمجھنے کے لیے فراق گورکھ پوری کا یہ جملہ ایک اعتبار سے ہماری خاص رونمائی کرتا ہے کہ ''اقبال اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ شعر کہتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں''۔ (۲) یوں تو مسلمان برصغیر میں ہمیشہ اقلیت ہی میں رہے لیکن اقبال کے زمانے میں یہ اقلیت زوال و ادبار کی اتھاہ پستیوں میں اتر چکی تھی۔ اقبال کے لیے یہ احساس نہایت تکلیف دہ تھا کہ وہ قوم جس نے کبھی اقوام عالم کے سامنے نہ صرف سیاسی اقتدار اور مدنی تصورات کے نمونے پیش کیے بلکہ ایک زمانے میں فکر و فلسفہ اور سائنس و تہذیب کے میدان میں بھی دنیا کی امامت کی تھی وہ آخر ایسی پست ہمتی کا شکار کیسے ہوگئی کہ اس نے آج غلامی تک کو قبول کر لیا ہے؟ لہٰذا اقبال کا مسئلہ دوہرا تھا: ایک بڑے دائرے میں ملت کا زوال اور چھوٹے دائرے میں ہندی مسلمانوں کی غلامی۔ اس لیے اقبال کی تمام فکری کاوشیں برصغیر کی مسلمانوں کو غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطہ زمین کا مالک بنانے اور پھر وہاں سے ساری ملت کی ایک نئی تشکیل اور نشاۃ ثانیہ کی منزل کی طرف گامزن کرنے کی آرزو کے گرد گھومتی ہیں۔ اس اعتبار سے اقبال کی فکری اسکیم میں پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی منزل نہیں بلکہ ایک جائے تمکین اور ماندگی کا وقفہ تھا، یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ لیکن اگر پاکستان اب تک اقبال کی اس آرزو کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بن سکا تو یہ فکر اقبال کا نہیں ہمارا المیہ ہے۔

میر سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

اقبال نے یہ کام مشرق اور مغرب کی تمام فکری تاریخ اور اس کے فلسفیانہ نظاموں سے پوری آگاہی اور شعور کے ساتھ کیا تھا____ انھوں نے یہ جان لیا تھا عہد جدید کا انسان کائنات کی روحانی تعبیر سے بچنے کے لیے ہر قیمت دینے کو تیار ہے خواہ یہ قیمت اس کے شعور کا منطقی ربط ہی کیوں نہ ہوں، اور یہ کہ مغرب کسی ایسے منہاج علمی کو سمجھنے کی صلاحیت بھی کھو چکا ہے جو ماورائے حواس ذریعہ علم کے جواز پر قائم ہو۔ اس لیے اقبال نے جو طریق استدلال اپنے خطبات میں استعمال کیا وہ اصول مماثلت پر قائم تطبیقی منہاج کا حامل تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر ظفر الحسن نے اقبال کے خطبات کو ایک نئے علم کلام کی بنا قرار دیا تھا۔ جس میں چند مماثل اور حسی اشیاء و مشاہدات کو بنیاد بنا کر کچھ ماروائی اور غیر حسی واردات کے لیے تقریب فہم کی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اقبال نے اپنے زمانے کے ایجابی فلسفوں، سائنسی دریافتوں، نفسیاتی حاصلاحات اور Ocult Sciences کے تجربات کو وحی اور مذہب کی واردات کی تفہیم کے لیے استعمال کیا۔ درج بالا طریق کار کا استعمال اقبال اپنے اس مخاطَب کی رعایت سے کرتے ہیں جس کی ذہنی تربیت ابتدائے بیسویں صدی کے فلسفیانہ و سائنسی منہاج پر ہوئی تھی۔ لیکن جوں ہی وہ شاعری کی طرف آتے ہیں تو ان کا طریق کار ذوقی و کشفی انداز کا ہو جاتا ہے۔ اور وہ ان مسائل کو

جمالیاتی تجربہ بنا کر مخاطَب (جو خطبات کے مخاطب سے یقیناً مختلف ہے) کے خون میں رچا بسا دیتے ہیں۔ اقبال کا یہی وہ فن ہے جو انہیں اردو کے قبل و بعد کے تمام شاعروں میں ممتاز کر دیتا ہے۔

امیر خسرو نے اپنے مذکورہ دیوان *غرۃ الکمال* میں لکھا ہے کہ بڑا شاعر (ان کی اصطلاح میں استاد) وہ ہوتا ہے جس کے کلام کی ''روش شیرینی اور سلاست کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ شعراء کی نہج پر ہو، واعظوں کے طریق پر نہ ہو'' (۷) شاعری کے ''شعراء کی نہج پر ہونے اور واعظوں کے طریق پر نہ ہونے'' کے لیے خسرو نے بتایا ہے کہ شعر میں دانائی پانچ ذرائع سے داخل ہوتی ہے۔ ۱۔ فاضلانہ ۲۔ حکیمانہ ۳۔ نیک طبعانہ ۴۔ عاشقانہ ۵۔ شاعرانہ۔۔۔۔ فاضلانہ شاعر: بسیار لفظی کی صنعت کا عاشق،۔۔۔ فارسی اشعار میں عربی (اور قباساً دیگر زبانوں کے) الفاظ پیوست کرنے والا ہوتا ہے؛ حکیمانہ: وہ جو سنائی، ناصر خسرو نیز دوسرے حکیمانہ طرز پسند کرے؛ نیک طبعانہ: جو تازہ غزلوں کا سفینہ تیار کرتا ہے مگر وہ اس سے دریا پار نہیں کر سکتا؛ عاشقانہ: وہ سوختہ جاں جس کی سرشت میں عشق ودیعت کر دیا گیا ہو، جس کے باطن میں رقت ہو، جس کا کوئی وقت رقت اور جوش سے خالی نہ ہو، جس کی زندگی مسلسل سوزش اور شورش میں گزرتی ہو، جس کے گھٹ میں معشوق اسطرح بیٹھ جائے کہ آتش عشق اسے راکھ کر دے؛ شاعرانہ: وہ جو دانش کی مذکورہ بالا تمام طرزوں کو کمال رسائی تک حاصل کر کے انہیں ان کے حق کے مطابق جانتا ہو۔ (۸)

ہندوستان میں سبک ہندی کی شعریات کے بانی امیر خسرو کے ان نکات کی روشنی میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام پر بادنیٰ تامل نظر ڈالنے والا شخص بھی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری شاعری کے دور آخر میں ''بڑی شاعری'' کے اس معیار پر اقبال سے زیادہ کوئی پورا نہیں اترتا۔ اقبال کے نظریہ فن کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ خون جگر سے فن کو نمود دینے کے قائل تھے۔ ان کی عمومی شہرت گو ایک پیغامبر کی شہرت ہے جس کے نزدیک فن محض ایک ذریعہ ترسیل تھا، اور خود بھی انہوں نے اکثر اس طرح کی باتیں کر رکھی ہیں کہ

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام ترا

مگر ساز سخن کو بہانہ کہنے والے اس حکیم کا یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قائل ہے کہ

جب ان کے ایک شعر

درمیان کارزار کفر و دیں ترکش ما را خدنگ آخریں

پر جسٹس دین محمد نے داد دی تو اقبال کا کہنا تھا ''دین محمد! یہ شعر میری چالیسویں کوشش کا نتیجہ ہے''۔ (۹) اس طرح خود اقبال کا کلام اس بات پر شاہد ہے کہ انہوں نے اگر اپنی شاعری سے ناقہ بے زمام کو یکسو کرنے کا کام لیا ہے تو یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ محض الہام اور نوائے سروش کا منتظر رہنے کی بجائے مرد ہنر کو مسلسل محنت کرتے رہنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں:

؎ ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد کوشش سے کہاں مرد ہنرمند ہے آزاد

اور وہ اقبال اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ مجھے تو فن شاعری سے کوئی تعلق نہیں میں تو کچھ ترسیل کرنا چاہتا ہوں پیغام پہنچانا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ ــــــ

اقبال کا یہی شعور فن ہے جو فنی تقاضوں اور مطالبات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور اعلیٰ حکمت و حقائق سے لے کر اپنے گرد و پیش کے

سیاسی وتہذیبی وقائع کو بھی کائناتی اور تقدیری معاملات کے پس منظر میں اپنے شعری وجدان کا حصہ بنالیتا ہے۔یہی وہ معجزۂ فن ہے جس کی نمو خون جگر سے ہوتی ہے۔اس تناظر میں جب ہم اقبال کی زندگی کے آخری برسوں کے برصغیر کے ادبی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اس وقت ایک طرف کارزار حیات سے گریزاں اردو کے جمال پسند رومان پرور محض جذبات نگاری اور حسن وعشق کے گن گانے اور جمالیاتی خودفراموشی میں مبتلا تھے، دوسری طرف مغرب کی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہمارا ادبی شعور صرف سیاسی ومعاشی مسائل کو مقصود ومطلوب مان کر ادب وشاعری کو ایک آلہ انقلاب کے طور پر استعمال کرتے ہوئے فن کے تقاضوں سے منہ موڑ بیٹھا تھا اور تیسری طرف کچھ جدیدیت پسند ادیب فن برائے فن کے نام پر خارجی زندگی کے حقائق سے صرف نظر کر کے صرف ذاتی آشوب کے بیان کو ہی شاعری کا بنیادی وظیفہ قرار دے رہے تھے۔ایسے میں اقبال کی حکیمانہ نظر اور ''شاعرانہ فکر محسوس'' شاعری کو فلسفے اور مذہب کا ہم مقام بنا دینے کا کارنامہ سرانجام دے چکی تھی اور وہ فیضی کے الفاظ میں کہہ رہے تھے۔

امروز نہ شاعرم حکیمم
دانندہ اسرار حادث و قدیم
عالم کہ بہ سحر کاری ژرف
از شعلہ تراش کردہ ام حرف

اقبال اس شعری روایت کے امین تھے جہاں شاعری کو جزو پیغمبری سمجھا جاتا تھا۔یہاں شاعری سے مراد وہ اعلیٰ شاعری ہی تھی جو فلسفہ اور مذہب سے ہم آہنگ ہو کر تصور انسان کائنات اور خدا کے باہمی تعلق کو اپنا موضوع بناتی ہے جس کی طرف انہوں نے اپنے خطبات کے شروع میں اشارہ کیا تھا۔اقبال کے بعد ہمارے ادیب اور شاعر اگر حیات وکائنات کے بڑے مسائل اور ملت اسلامیہ کی تقدیر کو داؤ پر لگانے والے حالات کا ادارک کا بھی اپنی ادبی کاوشوں میں کچھ حصہ رکھتے تو شاید آج ہم کسی بہتر مقام پر ہوتے۔ہماری ادبی وثقافتی دانش کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہمارا دانشور طبقہ اقبال کی اس آرزو کے احساس اور شعور سے لاتعلق ہو چکا ہے جس کا آخری آخری بیان اقبال نے اس شعر میں کیا تھا:

بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کی یہ آرزو اگر ہمارے لیے کوئی زندہ وجودی تجربہ رکھتی ہے اور اسے پانے کے لیے اگر ہم ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں تو کلام اقبال ہمیں ایک نئی زندگی دینے کا پورا سامان اپنے اندر رکھتا ہے اور اگر یہ آرزو ہمارے لیے محض ایک جذباتی نعرہ ہو یا ہم اسے محض ایک دیوانگی قرار دے کر خود کو اس سے لاتعلق کر لیں تو اقبال ہماری سمجھ میں کبھی نہیں آسکتے۔

اس پس منظر میں تصور آدم، تصور عالم اور تصور خدا کے حوالے سے اقبال کی اس تفتیش اور حاصل تفتیش کی ایک جھلک سے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مغرب کے سیکولر انسان پرستانہ تصورات کے مقابلے میں ان کے نتائج کتنے حیران کن تھے۔فلک قمر کے ایک غار میں آدم، عالم اور حق کے بارے میں یہ سوالات عارف ہندی (جہاں دوست) نے رومی سے پوچھے تھے:

چیست عالم، چیست آدم، چیست حق؟

جواباً رومی نے انسان کو شمشیر، حق کو دست شمشیر زن اور کائنات کو وہ پتھر قرار دیا جس پر تلوار کی دھار بنتی ہے۔پھر کہا کہ مشرق کی

نظر خدا پر رہی اور اس نے کائنات سے صرف نظر کیا جبکہ مغرب کی نظر کائنات میں الجھ کر رہ گئی اور خدا اسکی نظروں سے اوجھل ہو گیا، خدا پر نظر رکھنا عین عبادت ہے اور خود انسان کا اپنی حقیقت سے کما حقہ، واقف ہونا ہی زندگی ہے:

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن — عالم ، ایں شمشیر را سنگ فسن
شرق حق را دید و عالم را ندید — غرب در عالم خزید از حق رمید
چشم بر حق باز کردن بندگی است — خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

اور پھر آگے خود اقبال عارف ہندی کے سامنے ان اسرار سے مزید پردہ یوں اٹھاتے ہیں:

گفت مرگ عقل؟ گفتم ترک فکر — گفت مرگ قلب؟ گفتم ترک ذکر
گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گرد راہ — گفت جاں؟ گفتم کہ رمز لا الہ
گفت آدم؟ گفتم از اسرار اوست — گفت عالم؟ گفتم از خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست — گفت حجت چیست؟ گفتم روئے دوست
گفت دین عامیاں؟ گفتم شنید — گفت دین عارفاں؟ گفتم کہ دید! (۱۰)

ان اشعار کا مختصراً لب لباب یہ ہے کہ کائنات انسان کے لیے ہے اور انسان خدا کے لیے ہے۔یعنی ہر مرتبہ وجود اپنے سے نچلے دائرہ وجود کے لیے حاکم اور خود سے اعلیٰ کے لیے بمنزلہ خادم کے ہے۔

اس سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب کی عظمت آدم کی تحریک سے اگر متاثر بھی ہوئے تو ایک فرق کے ساتھ: مغرب کی انسان پرستی جہاں تحت وفوق سے تصور سے بیگانہ ہو کر محض انسان مرکز بن کر رہ گئی تھی وہاں اقبال نے عظمت آدم کے روایتی تصور سے جڑ کر اول و آخر ایک خدا مرکز تصور انسان اور تصور کائنات سے اپنا رشتہ نئے سرے سے تشکیل دیا تھا۔اس اعتبار سے ان کے تصور انسان کو اگر کوئی جدید عنوان ہی دینا ہو تو اسے Transcendental Humanism کہا جا سکتا ہے۔اس ملکوتی اور قدوسی تصور انسان پر ان کا یقین ہی انہیں رینے سانس کے بعد کے مغربی تصورات سے مختلف بناتا ہے۔ان کے بعض معترضین کے یہاں عام طور پر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اقبال مغربی افکار کے خوشہ چین ہیں، یہ انکی کلی معنویت اور اس فکری آرزو کو نہ سمجھنے یا اسے خاطر میں نہ لانے کی وجہ سے ہے جس پر غیر متزلزل یقین کی وجہ سے انہوں نے اپنی ضرب کلیم کو عہد حاضر کے خلاف اعلان جنگ سے تعبیر کیا تھا۔اس زمانے میں اور آج بھی یہ ایک ایسا اعلان ہے جس کی جرأت اقبال کے بعد ہمارے کسی شاعر ادیب اور دانشور کو، خواہ وہ اپنے تئیں خود کو کتنا ہی بڑا استعمار دشمن قرار دیتا ہو، نہیں ہو سکی تھی۔

حوالہ جات

۱. Allam Muhmmad Iqbal, *TheReconstruction of Religious Thoughts in Islam,* Iqbal Academy Pakistan, Lahore 1989, p.1

۲۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، شیخ غلام علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲۳

۳۔ محمد سہیل عمر، درآئینہ باز ہے، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۹، ص ۲۶

۴۔ خسرو، امیر، دیباچہ غرۃ الکمال، ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ، شہزاد، کراچی، ۱۴۲۵ھ، خصوصاً ص ۶۴ و بعد؛ نیز اس دیباچے سے اخذ ہونے والے تنقیدی تصورات کے تجزیے کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ از شمس الرحمٰن فاروقی

۵۔ سراج منیر، مقالات سراج منیر، مرتب، محمد سہیل عمر، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۳۶۳

۶۔ بحوالہ عسکری، محمد حسن، جھلکیاں، مکتبہ الروایت، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۵۰

۷۔ خسرو، امیر، دیباچہ غرۃ الکمال، ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ، شہزاد، کراچی، ۱۴۲۵ھ، خصوصاً ص ۶۴ و بعد؛ ص ۹۴

۸۔ ایضاً، ص ۸۹ و بعد

۹۔ بحوالہ فراقی، ڈاکٹر تحسین، اقبال چند نئے مباحث، ص ۱۷

۱۰۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، شیخ غلام علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲۵۔۲۲۳